ایمان افروز اور سبق آموز کہانیوں کا سلسلہ

آستین کے سانپ

کہانی نمبر 2

روح کی واپسی

اساس انسٹیٹیوٹ

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام مجموعہ:	آستین کے سانپ
نام کہانی:	روح کی واپسی
مصنف:	عزام محسن
تعداد:	ایک ہزار
تاریخ:	جنوری2024
زیرانتظام:	اساس انسٹیٹیوٹ
پبلشر:	اردوسرائے
رابطہ نمبر:	محمد عبداللہ 03349363518

دل کی بات

قدرت نے انسان کے سامنے دوراستے رکھے ہیں۔ایک حق اور دوسرا باطل...ایک سچ اور دوسرا جھوٹ...ایک صحیح اور دوسرا غلط...اس وقت دنیا میں جتنی بھی نظریاتی محنت ہورہی ہے،اس میں ہر کوئی اپنے آپ کو حق اور سچ کا دعویدار کہتے ہوئے دوسرے کو غلط اور جھوٹ ثابت کررہاہے۔

خالقِ کائنات نے اپنی کتاب،قرآن مجید فرقانِ حمید میں حق اور باطل کی نشانیاں واضح کی ہیں۔حق والوں کا راستہ بھی بتایاہے اور باطل کی ریشہ دوانیوں سے بھی پردہ چاک کیاہے۔باطل نے حق کا راستہ روکنے کے لیے کبھی علی الاعلان اُسے للکارا ہے اور کبھی حق کا جعلی روپ دھار کر بہروپیے کی شکل اختیار کی اور حق والوں کو سیدھے راستے سے بھٹکانے کی کوشش کی ہے۔اس ساری محنت کے پیچھے نسلِ آدم کا ازلی دشمن ابلیس ہی ہے۔

ابلیس جب سے راندۂ درگاہ ہوا،تب سے ہی انسان کو گمراہ کرنے پر لگا ہوا ہے۔ایسی صورتِ حال میں انسان کے لیے درست راستے کا انتخاب ضروری اور لازم ہو جاتا ہے۔ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ دراصل خاتم النبین ہیں۔ان کے بعد قیامت تک کوئی نبی اپنی نبوت کے ساتھ نہیں آئے گا، مگر قدرت کے اس فیصلے سے بغاوت کرنے والے کئی شیطان کے ہرکارے میدان میں آئے،اپنا اپنا منجن بیچا،عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔انہیں میں ایک نام مرزاغلام احمد قادیانی کا ہے جس نے خود کو یسوع مسیح کہتے ہوئے نبوت جیسے عظیم مرتبے کی توہین کی۔

مرزے کی سوچ دراصل ہندوستان میں انگریز سرکار کی طے شدہ پالیسی کا تسلسل تھی۔قیامِ پاکستان

کے بعد مرزے کے بدبخت پیروکاروں نے اس نئے اسلامی ملک میں اپنے پنجے گاڑنے شروع کردیے۔ مگر فدایانِ ختم نبوت کی بیش بہا قربانیوں کی بدولت حکومتِ پاکستان کو انھیں غیر مسلم اور کافر قرار دینا پڑا اور اب ان کا کفر آئینِ پاکستان کا حصہ ہے۔ مگر اس کے باوجود قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھے مسلمانوں کو بہکانے میں مصروف ہیں۔ اسی سلسلے میں ادارہ ''اساس'' نے بھرپور انداز میں جواب دیتے ہوئے اہلِ اسلام کو ان کی چالوں سے خبردار کیا ہے۔

قادیانیت کے مکروہ چہرے سے نقاب اتارتے ایسے واقعات، ایسی کہانیاں جو روز کہیں نہ کہیں وقوع پذیر ہوتی ہیں، ادارہ اساس نے انھیں جمع کر کے نئے اسلوب کے ساتھ ''آستین کے سانپ'' کا عنوان دیا ہے۔ یہ کہانیاں مختلف ذیلی عنوانات کے ساتھ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہیں۔ انھیں خود بھی پڑھیے اور دوسرے مسلمانوں تک پہنچانے میں ہمارے معاون بھی بنیے۔

اساس انسٹیٹیوٹ

روح کی واپسی

تاریخی لحاظ سے اہمیت کی حامل اور میوزک کنسرٹس کے لیے مشہور ہائیڈ پارک کے ہر گوشے سے مجھے انسیت سی ہو گئی تھی۔ خاص ترتیب سے لگے فوارے جو فضا میں پانی کو خوبصورتی سے بکھیرتے رہتے تھے۔ خوبصورت ٹائلوں سے بنی چھوٹی چھوٹی روشیں اور ان کے ساتھ مخصوص ترتیب سے لگائے گئے بلند درخت جو کبھی کبھی اپنا کوئی پتا نہایت خاموشی سے خوبصورت گھاس پر گرادیتے۔

7جولائی 2005ء کے حملے میں مارے گئے باون افراد کی یاد میں لگائے گئے باون سٹیل کے پلرز جو درختوں کے درمیان ایک روش پر لگائے گئے تھے اور ڈرنکنگ ہارس۔ یہ خوبصورت پارک میرے لیے ایک مکمل جہان تھا۔ بیرونی دنیا سے ہٹ کر، جو مجھے اپنے آپ میں سمیٹ لیا کرتا تھا۔

میں یہاں سکون کی تلاش میں شام کو آیا کرتا تھا۔ بعض اوقات ہمیں اپنی ذات سے فرار چاہیے ہوتا ہے، اور تب ہم کوئی کونہ ڈھونڈتے ہیں۔ ایک کونہ جہاں ہم سب سے روپوش ہو سکیں، اپنے آپ سے بھی....!!

دسمبر کی اس یخ بستہ شام ہلکی ہلکی دھند نے حسبِ معمول پارک میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ کچھ معمر خواتین اور مرد اپنی اپنی معمول کی ایکسر سائز میں مصروف تھے۔ بوڑھے جیمز نے مجھے دیکھ کر دور سے ہاتھ ہلایا تھا۔ جواباً میں نے بھی ہاتھ ہلا کر اسے ہیلو کہا۔ جیمز یہاں کا مالی تھا اور پچھلے تین سال سے اس کا اور میرا یہی معمول تھا۔ میرا ٹھکانہ پارک کے آخری سرے پر روش

کنارے موجود ایک بینچ تھی جس کے بالکل سامنے ایک فوارہ پانی کو اوپر اچھالنے کے اپنے معمول میں لگا ہوتا تھا۔اس شام میری روح نے میرے وجود کو پھر سے تھکا دیا تھا۔

جسم اور روح کا قدرت نے ایک خاص تعلق رکھ چھوڑا ہے۔روح کو اگر سکون حاصل نہیں تو جسم خواہ مخواہ پرایا روگ پال لیتا ہے۔بے زار طبیعت کے ساتھ میں پارک میں چلا آیا تھا۔روزانہ کی طرح یہاں مجھے پھر سے پناہ مل گئی تھی۔میری مخصوص بینچ خالی تھی۔وہ میرا مقدر تھی۔اسے خالی ہی ہونا چاہیے تھا۔میں کچھ دیر کے لیے اپنی روح سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا یا شاید ان یادوں سے جو میری روح کے ساتھ جڑی تھیں۔میرا وجود کھوکھلا ہو رہا تھا۔

تین سال.... مٹی سے بنے نرم و نازک اور دردِ مسلسل سے نبرد آزما وجود کی توڑ پھوڑ کے لیے اتنے سال بہت ہوتے ہیں اور میں تو بس کچھ لمحوں کا ہی وار سہہ سکا تھا۔دکھ اور تکلیف کی شدت والے کچھ لمحے۔بعض لمحوں میں ماہ و سال پوشیدہ ہوتے ہیں۔قریب میں مجھے ایک فیملی دکھائی دی تھی۔میاں بیوی اور ان کے ساتھ دو چھوٹے بچے۔۔میں وہاں'اس بینچ پر خاموشی سے بیٹھا اس فیملی کو دیکھ رہا تھا۔

''فیملی!'' بے اختیار میرے لبوں ایک آہ نکل گئی تھی:''فیملی تو میری بھی ہونی چاہیے تھی۔لیکن اگر.....''وہ''جو دغا دے کر نہ جاتی تو.....!!

شاید میرے خدا نے ساری دنیا کی آزمائشیں میرے حصے میں ڈال دی تھیں۔مجھے اپنے خدا سے بہت سی شکایتیں تھیں اور بہت سے شکوے۔بہت بار ہمیں بتایا جاتا ہے کہ شکووں کا اختیار ہمارے پاس نہیں لیکن اگر ہمیں اللہ سے شکوے نہیں کرنے چاہئیں، تو پھر کس سے کریں، کہاں جائیں، کوئی جائے پناہ نہیں، کسی سے امید نہیں۔اور شکوہ بھی تو انسان اسی سے کرتا ہے جس سے امیدیں ہوں، جس سے محبت ہو۔اور ہماری محبت، ہماری امیدیں، ہمارا سب کچھ اپنے اللہ سے ہی تو ہے۔اس کی بارگاہ میں شکوے اور شکایات کیوں نہ لے کر جائیں۔

وہ تو بہت محبت کرتا ہے ہم سے بہت رحمان اور بہت رحیم... ہماری تھوڑی سی شرمندگی اور چند آنسوؤں سے مان جانے والا.....!!اور پھر وہاں بنا کسی تفریق کے محبتیں بٹتی ہیں'بعض دفعہ ہم

رب کو مناتے ہیں اور بعض دفعہ رب ہمیں.... پھر وہ ہمیں سکون کی دولت سے نوازتا ہے اور پھر وہ ہمارے شکوے دور کرتا ہے اور شکوے جب دور کر دیے جائیں، تو دل قریب آجاتے ہیں، محبت کے خوش نما رنگ بکھرتے ہیں جو پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت اور دیرپا ہوتے ہیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہے۔

میں نے سر اٹھایا۔ بلیک کپڑوں میں ملبوس وہ تقریباً چھ سال کی ایک بچی تھی جو قدرے فاصلے سے مجھے آوازیں دے کر اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فٹ بال سے کھیلتے ہوئے اس کی بال میری طرف آگئی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میں اسے وہ بال لوٹا دوں۔

اس نے مجھے آوازیں دی تھیں اور میں اپنی جگہ سے اُٹھ کر قریب پڑی بال کی طرف بڑھ گیا تھا۔ خاموشی سے میں نے بال اس کی طرف لڑھکا دی تھی اور تب میں نے دیکھا تھا، وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ معذور تھی۔ میری نظروں کے سامنے ایک پل کے لیے ایک چہرہ لہرایا تھا۔

مگر دوسرے ہی لمحے میں نے وہاں سے وہ چہرہ کھرچ کر مٹا دیا تھا۔ مجھے ایسا کرنا پڑا تھا۔ وہ بچی لنگڑاتے ہوئے شاید مجھے تھینک یو کہنے کے لیے وہاں سے چل کے آگئی تھی۔

"تھینکس انکل!" وہ اپنے ننھے ہاتھ مجھ سے ملانے کے لیے بڑھا رہی تھی۔

"اِٹس اوکے لٹل اینجل..." میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا تھا۔ اور میری بات پر وہ مسکرا اٹھی تھی۔

اکثر اوقات کسی کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کے لیے محض دو میٹھے بول ہی کافی ہوتے ہیں مگر ہم سے یہ بھی نہیں ہو پاتا یا شاید ہم کسی اور کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھنا نہیں چاہتے تب جب خود ہمارے حصے میں مسکراہٹیں نہ ہوں۔

واپس جاتے ہوئے اس بچی نے مڑ کر میری طرف دیکھا تھا اور پھر اپنے ہاتھ ہلائے تھے۔ وہ مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔ جواباً میں نے بھی ہاتھ ہلا دیے تھے۔

.....☆....

دوسری شام شاید میں وقت سے کچھ پہلے آگیا تھا۔ پارک میں سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ جیمز نے

ویسے ہی مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ ہلایا تھا، بوڑھی عورتیں اور بوڑھے مرد بھی وہاں تھے اور وہاں میرا خالی بنچ بھی تو تھا۔

پارک کے اندر دل کو خوش کرنے والے مناظر کم نہیں تھے، قریب میں کہیں میوزک کنسرٹ ہونے ولا تھا اور وہاں کافی چہل پہل تھی لیکن اس وقت میں وہاں نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ کالج کے لڑکوں کا ایک گروپ فٹ بال کھیل رہا تھا اور وہ مجھے بار بار شریک ہونے پر اکسار ہے تھے۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پاکر ایک لڑکا میری طرف آیا تھا:

One of our friends is missing today.Would you like to join us'?

میں نے اس لڑکے کو انکار کر دیا تھا مگر پھر وہ سب کے سب میرے پاس آگئے تھے اور کھیل میں شریک ہونے کے لیے منتیں کرنے لگے تھے۔ میں اتنی ساری محبتوں کو دھتکار نہیں سکتا تھا۔ میں نے کھیلنے کی حامی بھری تو ان کی جان میں جان آئی۔

میں فٹ بال کا اچھا کھلاڑی تھا اور کالج میں فٹ بال ٹیم کا کپتان رہا تھا۔ میچ ہماری ٹیم نے باسانی جیت لیا تھا اور میچ کے بعد انہوں نے ضد کر کے مجھے اپنی پارٹی میں شریک کر لیا تھا۔ جو لڑکا مجھے بلانے کے لیے آیا تھا اس کا نام جوزف تھا۔ وہ مجھ سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اس چھوٹی سی پارٹی کے اختتام تک جوزف مجھ سے میرا فون نمبر، ایڈریس وغیرہ لے چکا تھا۔

....☆....

ابتسام کا فون آیا تھا:

”عفان تیار ہو جاؤ، ہم کہیں جا رہے ہیں۔ میں پندرہ منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔“

”مگر ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

مجھے ابتسام کے سرپرائزنگ پروگراموں پر ہمیشہ جانا ہی پڑتا تھا اور یہ پروگرامز اکثر چیریٹی پروگرامز ہوتے تھے۔ کبھی کسی ہسپتال کے لیے تو کبھی معذور بچوں اور بے گھر بوڑھوں کے لیے۔ ابتسام بس ایسا ہی تھا۔

''تمہیں اچھی طرح سے پتا ہے کہ میں تمہیں اس کا جواب نہیں دوں گا۔ اور دیکھو، آج تو خود تیار ہو جاؤ۔ وقت کم ہے۔''

وہ باقاعدہ منتیں کر رہا تھا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

''اور تمہیں اچھی طرح سے پتا ہے کہ میں تمہاری اس بات کا کیا جواب دوں گا۔ جلدی پہنچو، میرے کپڑے بھی پریس کرنے ہیں اور جوتے بھی پالش کرنے ہیں۔ مجھے بھی اپنا خط بھی بنوانا ہے۔''

''کم آن عفان! تمہیں کسی نے بتایا نہیں۔ تم بڑھے ہوئے خط میں زیادہ ہینڈسم لگتے ہو۔'' مجھے جلدی تیار کروانے کے لیے اس کا یہ آخری حربہ ہوتا تھا اور یہ کبھی کارگر ثابت نہیں ہوا تھا۔

ابتسام...... ابتسام سے میری دوستی ''ویسٹ فیلڈ شاپنگ سنٹر'' میں بالکل اچانک ہو گئی تھی۔ اس دن میرا والٹ گاڑی میں رہ گیا تھا اور میں ویٹر سے ایکسکیوز کر کے والٹ لانے کے لیے اٹھ رہا تھا جب ساتھ والی ٹیبل سے ابتسام اُٹھ کے آیا تھا۔

''یُو پاکستانی...؟''

''یس...؟''

''ابتسام، کراچی سے۔'' اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا تھا۔

''عفان عادل، فیصل آباد سے۔''

میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا تھا اور پھر میرے منع کرنے کے باوجود اس نے میرا بِل ادا کر دیا تھا۔

''اگر آپ کے پاس کچھ وقت ہو تو میرے ساتھ چائے پئیں گے؟ میرا فلیٹ یہیں قریب ہی ہے۔''

وہ اصرار کر کے مجھے اپنے فلیٹ پر لے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ پہلی ملاقات میں ہی ہم ایک دوسرے سے خاصے بے تکلف ہو گئے تھے۔

اور پھر ہم دونوں بہت جلد ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ کھانا پکانے سے لے کر کپڑ یا استری کرنے تک میرے ذاتی کام سارے ابتسام کے ہی ذمے ہوتے تھے۔

"نکما.... نالائق.... کام چور......!!"

فون بند کرنے سے پہلے اس نے ہمیشہ کی طرح میرے ناموں میں سے کچھ نام دہرائے تھے۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

میری توقع کے عین مطابق یہ ایک چیریٹی ڈنر تقریب تھی جو کینسر کے مریضوں کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ میں اس طرح کی تقریبات میں یہاں کے لوگوں کو خطیر رقم دیتے ہوئے دیکھتا تھا تو عجیب لگتا تھا، کیوں کہ میری نظر میں اپنے محلے کی چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری والی مسجد گھوم جاتی تھی۔ میرے والد صاحب شہر کے بہت بڑے بزنس مین تھے۔ان کا کروڑوں روپے کا بینک بیلنس ہوتا تھا۔ شاندار گاڑیاں اور نوکروں کی پوری ایک فوج ہمارے اس پانچ کنال کے بنگلے میں ہوتی تھی۔

ہر رمضان کی ستائیسویں کو وہ گھر میں افطار پارٹی ضرور کراتے تھے جس میں شہر کے سب بزنس مین مدعو ہوتے تھے مگر معمول کے دنوں کی طرح اس دن بھی ان کے در سے کسی ضرورت مند کو جھاڑ کے علاوہ کچھ نہیں ملتا تھا۔ ہر جمعے کو محلے کی مسجد میں چندہ دیتے وقت بھی وہ بمشکل پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال پاتے تھے۔ سو ایسی تقاریب مجھے بناوٹی ہی لگتی تھیں۔

کھانے کے بعد ابتسام کو وہاں کوئی جاننے والا مل گیا تھا۔ میں اسے اس کے ساتھ چھوڑ کے ہال سے باہر نکل آیا تھا۔ہال میں جاری سرگرمیوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اس لمحے سگریٹ سلگا رہا تھا جب ابتسام مجھے پکارتا ہوا اس طرف آ نکلا تھا۔

"عفان ! تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔آؤ میرے ساتھ۔" وہ مجھے اندر اس ہال میں پھر سے لے جانا چاہ رہا تھا۔

"نہیں یار ! اس وقت دل نہیں کر رہا، پھر کبھی۔"

"میں کسی سے ملوانے کی بات کر رہا ہوں عفان۔اب آؤ بھی۔"

مجھے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں سگریٹ پھینک کر اس کے ساتھ چل دیا تھا۔

”عفان! یہ آپ کی ہونے والی بھابھی ہیں.... اور ڈیئر.... یہ ڈاکٹر عفان عادل ہیں، بطور ہارٹ اسپیشلسٹ کام کرتے ہیں۔“

مجھے دیکھتے ہی وہ ایک دم ٹھٹکی۔ یوں محسوس ہوا کہ میرے پاؤں تلے سے جیسے زمین سرک رہی ہو۔ میں ہکا بکا کھڑا قدرت کے اتفاقات پر حیران تھا۔ یہ حورب تھی۔ اس نے فوراً اپنا منہ چھپانا چاہا مگر وہ ناکام رہی، پھر ایک حیرت بھری نظر اس نے مجھ پر ڈالی اور انجان بننے کی اداکاری کرنے لگی۔ مگر اس کے لیے اب انجان بننا ممکن نہ تھا۔ ہم دونوں کے چہروں کے تاثرات دیکھ کر ابتسام حیرت زدہ تھا۔

حورب نے فیصل آباد کے پنجاب میڈیکل کالج میں مجھے اپنی زلفوں کا اسیر بنایا تھا۔ جہاں میں اس کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کے مذہبی لگاؤ سے متاثر ہوا تھا۔ میں اونچے خاندان کا بگڑا ہوا شہزادہ تھا مگر اچانک اپنے ایک دوست کے ایکسیڈنٹ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ خود بہ خود میرا مذہب کی طرف رجحان بڑھنے لگا تھا۔ اسی دوران حورب سے میری ملاقات سونے پہ سہاگا تھی۔

مجھے مذہب بارے کچھ خاص معلومات نہیں تھیں، نماز تک درست پڑھنا نہ آتی تھی۔ حورب نے دین سیکھنے کے لیے میری راہنمائی کی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ ایک روز ہم میڈیکل کالج کی کینٹین کے باہر دھوپ میں بیٹھے تھے۔ تب کسی طالب علم نے حورب اور اس کی ایک سہیلی کو کفریہ عقائد والا کہا تو میرا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا تھا۔ مجھے حورب کی زبانی پتا چلا کہ مولویوں نے ہمارے معاشرے میں زہر گھول کے رکھ دیا ہے۔

مزید اس نے کہا تھا کہ کوئی شخص اگر حضرت عبدالقادر جیلانی کو اپنا مذہبی پیشوا کہتا تو اس کی مرضی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی آدمی حضرت غلام احمد کو اپنا مذہبی راہنما تصور کرتا ہے تو یہ بھی سراسر اُس کی اپنی چوائس ہے۔ یہ سب باتیں مجھے حورب سے پتا چلیں تو سب کچھ میرے دل کو لگا تھا۔ لیکن میں شدید پریشان تھا کہ آخر یہ مولوی اپنی دال روٹی کے لیے مسلک مسلک اور کفر کفر

کیوں کھیلتے ہیں۔

حورب کو سامنے دیکھ کر مجھے رہ رہ کر اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔

وہ خوبصورت پل جب اُس نے مجھے پرپوز کیا۔ وہ حسین یادیں کہ جب میں اس کے عشق میں گھلتا ہی چلا گیا۔ پھر وہ یادگار لمحات کہ جب دو سالہ دوستی کے بعد ہم شادی کے بندھن میں بندھے۔ مگر.... مگر میں اس سے آگے کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم ہنی مون کے لیے کینیڈا آ ئیں تھے کہ جب مجھ پر قیامت ٹوٹی تھی۔ ٹورنٹو میں ہم نے اپنا قیام دو ماہ بڑھا لیا تھا، پھر ایک دن وہیں مجھے دردناک اطلاع ملی تھی، وہ اذیت بھرے لمحے کبھی بھولیں گے نہیں کہ جب حورب کو انجان لوگوں نے ''اغوا'' کر لیا تھا۔ انھوں نے صرف کال کر کے اطلاع دی تھی کہ حورب اب ہمارے قبضے میں ہے۔ جان کی امان چاہتے ہو تو پیچھے مت آنا۔

اپنے تیئں میں نے ہر کوشش کی تھی۔ مگر کینیڈا کی پولیس کے مطابق یہ اغوا کا کیس نہیں ہے۔ بلکہ اس نام کی لڑکی اپنی مرضی سے آسٹریلیا گئی ہے۔ اُس کے سارے سفری ریکارڈ میرے سامنے تھے۔ میرے دماغ میں بار بار برے خیالات جنم لے رہے تھے کہ کیا حورب نے مجھے دھوکا دیا ہو گا؟ مگر کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟

میں نے تو اس کے ساتھ ہمیشہ ہی اچھا کیا تھا۔ پنجاب میڈیکل کالج میں جب ایک مذہبی معاملے پر فساد کے بعد حورب اور اس کے کئی ''ہم مسلک'' طلبا و طالبات کو کالج سے نکالا گیا تھا تو میں نے پاپا کا سیاسی و کاروباری اثر و رسوخ استعمال کیا تھا۔ وہ سب طلبا ہماری سیاسی اشرافیہ نے مل کر بحال کروائے تھے۔ یہی وہ کام تھا جس پر حورب نے رو رو کر میرا شکریہ ادا کیا تھا اور پھر مجھے پرپوز کر دیا تھا۔

میں ابتسام کے سامنے بت بنا کھڑا تھا۔ کیا حورب کو ابتسام نے اغوا کروایا تھا؟ اگر ایسا ہی ہے تو یہ انجانے میں میرا دوست کیوں بنا؟ کیا حورب اور ابتسام کسی خاص گروہ کا حصہ ہیں؟ کیا حورب میرے بعد ابتسام سے بھی دھوکا کرے گی؟ یا اس کا اصل عشق ابتسام ہی تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کس انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کروں۔

ابھی میں انھی سوچوں میں گم تھا کہ حورب ابتسام کا ہاتھ چھڑا کر تیزی سے دور ہو گئی، وہ شاید سمجھ چکی تھی کہ میں اس سے ماضی کا حساب لینے نہ بیٹھ جاؤں،

میرے ساتھ تو قدرت کا کھیل ہوا تھا۔

''ہیلو! جانی! کدھر گم ہو؟ کون سی سوچوں میں کھوئے ہو؟اور...اور یہ حورب.... تمہاری طرف دیکھ کر کیوں حیران تھی۔''

ابتسام کو یا تو کچھ معلوم نہیں تھا اور یا وہ بھولا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔اتنے مجھے معلوم تھا کہ حورب کی طرح ابتسام کا مذہبی علم بھی مجھ سے زیادہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اپنے زخم نہ کریدوں۔ماضی کی تلخ یادوں کو اپنے تک رہنے دوں، مگر ابتسام مجھے بار بار مجبور کر رہا تھا۔حورب کے جانے کے بعد وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر ایک کیفے میں لے گیا، جاتے ہی اس نے چائے کا آرڈر دیا۔

میں نے اس کی ضد پر زبان کھولنا شروع کی۔

''ابتسام! تم حورب کو کب سے جانتے ہو؟''میرا سوال ابتسام کو شاید اچھا نہ لگا ہو، مگر اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

''سات ماہ ہوگئے ہیں۔ یہ اتفاقیہ ملاقات تھی عفان! اب تو ہم میاں بیوی بننے والے ہیں۔''اس نے بتایا تو ایک پہاڑ جیسے مجھ پہ گرا ہو۔

''میں حورب کو کئی سال سے جانتا ہوں۔''

یہ سنتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے سچ نکل گیا تھا، پھر ابتسام تو ہے ہی بلا کا ضدی...، ضد کر کے مجھ سے ایک ایک راز اگلوانے لگا۔اس دوران وہ کئی بار حیرت کے سمندر میں ڈوبا تھا۔ مگر جب اسے پتا چلا کہ وہ میری بیوی بھی رہ چکی ہے اور مجھے دھوکا.....اس سے آگے ابتسام میں سننے کی ہمت نہ تھی شاید۔وہ جلدی سے اٹھا اور مجھ سے سلام لیے بغیر ہی گاڑی لے کر کہیں نکل گیا۔

میرے دل میں افسوس کے ساتھ ساتھ ایک خوف بھی تھا۔نہ جانے اب ابتسام مجھ سے آئندہ بات چیت کرے یا نہیں، نہ جانے وہ حورب سے کیسا سلوک کرے۔کئی وساوس میرے دل

میں جنم لے رہے تھے۔ تین دن تک مجھے ان دونوں کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ پھر ایک دن اچانک ابتسام کا فون آیا۔ وہ غصے میں تھا۔

"کہاں ہو؟"

"اپنے ٹھکانے پہ..."

"ٹھیک سے پھوٹو...." وہ چیخ کر بولا۔

"ارے یار وہی.... ہائیڈ پارک..." میں صرف اتنا کہہ پایا۔

تقریباً نصف گھنٹا بعد وہ میرے سامنے تھا اور تیز تیز چلتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کی آنکھوں میں خون ہے۔ انتقام کی آگ ہے۔ نفرت اور غصہ ہے۔ مگر.... مگر یہ کیا، آتے ہی وہ مجھ سے ایسے چمٹا جیسے برسوں کا بچھڑا ہو۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رو رہا تھا۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ آخر ہم ایک کونے میں بیٹھے اور بات شروع کی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے میں نیا جنم لے رہا ہوں، مجھے کسی حقیقت کا علم ہی نہیں تھا۔ مگر وہ مجھے بتا رہا تھا۔

"عفان........ میں تین دن سے اس کے پیچھے ہوں۔ میں نے مکمل جانچ پڑتال کی ہے۔ وہ.....وہ.....وہ ناں دراصل....."

اتنا کہہ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور چہرے پر پشیمانی کے آثار واضح تھے۔ دراصل ابتسام تین دن میں حورب کے بارے مکمل تحقیق کر کے آیا تھا۔ اور اب میرے صدقے واری جا رہا تھا۔

"وہ کم بخت! ہمارے ایمان کی سوداگر نکلی۔ قادیانی گروہ کی خاص رکن تھی وہ..... تم مجھ سے اپنی بات شئیر نہ کرتے تو مجھے اس کے بارے میں شاید اتنی جلدی پتا نہ چلتا۔ بس تمھاری وجہ سے میری بچت ہو گئی۔"' وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا، اس کی آواز میں درد تھا۔ افسوس تھا۔

اب میری جانے بلا کہ کون قادیانی اور کیسا مسلک؟ مگر ابتسام نے مجھے جھنجھوڑا، وہ جیسا بھی تھا مگر تھا تو ایک عالم دین پوتا۔ گو کہ اس کے ابو دنیادار اور کاروباری تھے۔ مگر ابتسام اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے کچھ بنیادی چیزوں اور عقائد سے واقف تھا۔

"ارے عفان یار.... ! یہ مسلک کا نہیں، ایمان کا معاملہ ہے، ختم نبوت کا معاملہ ہے۔ مجھے چیریٹی تقریب کے لیے حورب اور اس کے کزن نے ہی دعوت دی تھی۔ حورب سے میری وہیں پہ ملاقات ہوئی تھی، پھر یہ ملاقاتیں اور چیریٹی تقاریب میں جانا معمول بن گیا تھا۔ اب مجھے ان تقاریب اور فنڈز کی حقیقت کا بھی پتا چلانا ہے۔ یہی فنڈز پھر پاکستان میں خاص مقاصد کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔"

ابتسام نے مجھے قادیانیت اور مرزائیت بارے بنیادی معلومات دیں تو میں ہکابکا رہ گیا۔ اپنی کم علمی اور کوتاہی کا مجھے ادراک تھا، مگر میں اس قدر اندھیرے میں تھا، یہ آج علم ہوا تھا۔

"اف میرے خدا.... تیرا جتنا شکر کروں کم ہے۔" مجھے رہ رہ کر اپنے پنجاب میڈیکل کالج کے اُن دوستوں سے تعلق یاد آرہا تھا، جنھیں محض مسلک کا اختلاف سمجھ کر ہمدردی کیا کرتا تھا۔ مجھے ابتسام کا زندگی بھر مقروض رہنا تھا۔ مگر اُلٹا وہ میرا شکریہ ادا کیے جارہا تھا۔

ہم پارک میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ اچانک جوزف مجھے کھیل کے لیے مدعو کرنے آگیا۔

"ارے جوزف تم...؟ ابتسام نیا سے آگے بڑھ کر سلام لیا۔ معلوم ہوا کہ جوزف کے والد بہت بڑے آفیسر ہیں اور حورب کی فیملی کے ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہیں بلکہ حورب اور اس کے تمام دوستوں کا یہاں کے افسروں میں خاصا اثرورسوخ ہے۔

الجھی کوئی گتھیاں اب سلجھتی جارہی تھیں۔ مجھے پہلی بار ختم نبوت کے اصل معانی و مطالب مزید یہ کہ ختم نبوت کے حقیقی مشن کا معلوم ہوا تھا۔ اللہ مجھے معاف فرمائے، میرے لیے ابتسام تو راہ حق کا چراغ ثابت ہوا، مگر..... مگر میرے دیگر کلاس فیلوز جو میڈیکل کالج میں قادیانی طلبا و طالبات سے متاثر تھے ان کا کیا بنا ہوگا؟ باقی مسلمانوں کا کیا بنے گا جو دھوکے میں جی رہے ہیں؟

قادیانی فتنہ عالمی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ مل کر دنیا بھر میں معصوم مسلمانوں کے اذہان سے کھیلنے میں مصروف ہے، مگر ہم مسلمان کب غفلت کی چادر اتاریں گے؟ کب ہم آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خالی خولی عشق کے نعرے لگاتے رہیں گے۔

میں اب بھی روزانہ ہائیڈ پارک آتا ہوں۔

مگر اب میری روح مجھ میں واپس آچکی ہے۔زندگی کا سکون،دل کا چین گویا میری دنیا،میرا دین،میری آخرت،سب کچھ تو ہے میرے پاس،مجھے بس اپنے رب کو راضی کرنا ہے اور اپنے رب کے حبیب کو اپنا رہبر و راہنما تا قیامت ماننا ہے اور اس کی ختم نبوت کا دفاع آخری سانس تک کرنا ہے۔

☆....☆....☆